ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا نظری و فکری ارتقا (مصاحبوں کی روشنی میں)

The Intellectual and Ideological Evolution of Dr Khawaja M Zakariya (In the Light of Interviews)

حافظ صفوان محمد [i]

Abstract:

This article is basing on the book "Dr Khawaja Muhammad Zakariya: Afkar o Guftar". It caters scores of interviews of Dr Khawaja Muhammad Zakariya. Starting from a convincing parable of an unstructured telephonic interview which the author himself took over a span of couple of weeks, many an interview hold Dr Khawaja's talk & reflections on variety of topics including his family & personality, tradition of poetry & poetics, history of Urdu literature, linguistics, linguistic research in Urdu, teaching of Urdu to the foreigners/non-native speakers, language policy, language politics, implementation of Urdu as state/official language, implementation of Punjabi as the provincial language, university & students' politics, power politics, and the like. As this book contains interviews that were taken in almost half a century, Dr Khawaja's varying literary thoughts, notions and theories can be well judged through the lens of this very lexis. The author of this article grades the interview taken by Dr Faiza Butt & Rabia Hijab as the most versatile and complete one. In the end the author suggests some additions/corrections that need be taken into account in the next edition of this compilation.

Keywords: *Khawaja Zakariya, Interview, Tradition of poetry, Teaching of Urdu to the foreigners, Language policy, Language politics, Implementation of Urdu as state/official language.*

یہ مقالہ بنیادی طور پر کتاب "ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار" کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے متعدد مصاحبوں کو شامل کیا گیا ہے۔ مضمون کا آغاز مقالہ نگار کے خود لیے گئے ایک غیر رسمی ٹیلی فونک استفساریے سے ہوتا ہے ، جو کئی ہفتوں پر محیط رہا۔ اِس کے بعد متعدد مصاحبوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی گفتگو اور اُن کے خیالات کو مختلف موضوعات پر پیش کیا گیا ہے ، جن میں ان کا خاندانی پس منظر اور شخصیت ، شاعری اور شعریات کی روایت ، اردو ادب کی تاریخ ، لسانیات ، اردو میں لسانی تحقیق ، غیر ملکیوں یا غیر مادری زبان بولنے والوں کو اردو سکھانے کا عمل ، لسانی پالیسی ، لسانی سیاست ، اردو کو بہ طور سرکاری و قومی زبان نافذ کرنے کے مسائل ، پنجابی کو صوبائی زبان کے طور پر رائج کرنے کی بحث ، جامعاتی و طلبہ کی سیاست ، طاقت کی سیاست اور اِسی نوع کے دیگر موضوعات شامل ہیں۔ چوں کہ یہ مصاحبے قریبًا نصف صدی کے عرصے میں لیے گئے ہیں اِس لیے ڈاکٹر خواجہ کے فکری ارتقا ، اُن کے ادبی خیالات ، نظریات اور رجحانات کو اِس متن کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مضمون نگار کے نزدیک ڈاکٹر فائزہ بٹ اور رابعہ حجاب کا لیا گیا مصاحبہ سب سے جامع ، متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ آخر میں مضمون نگار کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں بعض اضافوں اور اصلاحات کی سفارش بھی کرتا ہے جن پر توجہ دینا ضروری ہے۔

کلیدی الفاظ: خواجہ زکریا ، مصاحبہ ، شاعری کی روایت ، غیر ملکیوں کو اردو سکھانے کا عمل ، لسانی پالیسی ، لسانی سیاست ، اردو کو بہ طور ریاستی اور سرکاری زبان نافذ کرنے کا عمل۔

یہ ۲۰۰۷ء کے اوائل کی بات ہے کہ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو و اقبالیات کے صدر نشین ڈاکٹر شفیق احمد کے کہنے پر مجھے ایم اے اردو کرنے کا شوق چرایا۔ امتحان چوں کہ بہ مشکل ایک ہفتے کی دوری پر تھے، فوراً 'ایم اے اردو و اقبالیات' کے امتحان کی لیٹ فیس بھری اور پچھلے پانچ سال کے پرچے

[i] انڈی پنڈینٹ سکالر ، بہاول پور (Corresponding Author)

خرید لیے۔ مجوزہ کتابوں میں سے جو والدِ گرامی پروفیسر عابد صدیق کی ذاتی لائبریری میں نہ ملیں اُن کی فراہمی کے لیے پشاور کے ڈاکٹر صابر کلوروی اور انجینئر ڈاکٹر ذکاء اللہ خاں سے لے کر کراچی کے عزیزم ناصر جاوید تک سب کو تکلیف دے ڈالی۔ یہاں تک کہ لاہور سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے اُن کی ذاتی لائبریری سے بھی بعض کتابیں مستعار لیں۔

امتحانی شیڈول میں گیارہ پرچوں میں عموماً دو دن کی چھٹی تھی، اور پہلا پرچہ تین دن کے فاصلے پر تھا۔ ایک کتاب کھولی تو مرزا سلامت علی دبیرؔ کے شعر ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے'' پر نگاہ جا ٹھہری۔ یہ شعر یقیناً بلیغ استعارہ تھا کہ 'شیر' سے مراد 'امتحان' ہے اور 'رن' سے لامحالہ یہ 'ہیچ مدان'۔ بلائے صحبتِ لیلیٰ یعنی کتابیں دیکھ کر کانپا چڑھتا جاتا تھا۔ اگلی رات اِن کتابوں کے ساتھ گزاری تو امتحان دینے سے توبہ کر لی اور فیس یونیورسٹی کو بہ پرورشِ خاوندانہ دان دینے کا فیصلہ کر لیا مگر اگلی صبح ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا فون آیا اور اُنھوں نے ابا جان کے دیوان پانی میں ماہتاب کا دوسرا ایڈیشن[1] شائع ہونے کی خوش خبری دی۔ پھر اُنھوں نے امتحان کا پوچھا تو میں نے دبیرؔ کے مرثیے کا مصرع ''سب بھول گئے اپنا حسب اور نسب آج''[2] زبانِ حال سے کہہ سنایا۔ اُنھوں نے اشک شوئی کی اور کہا کہ عبور مکمل کرنے بعد ہر پرچے سے پہلے اُنھیں فون کر کے مشکل چیزیں پوچھ لیا کروں۔ یہ سنتے ہی جان میں جان آئی اور مطالعہ شروع کر دیا۔ بیشتر کتابوں میں سوالات کے جوابات میں کوئی سائنسی ترتیب نہیں تھی۔ اکثر چیزیں الل ٹپ لکھی معلوم ہوئیں جس سے شدید کوفت ہوئی۔ یہاں Describe your answer in three words کا ٹریننگ والا تجربہ کام آیا۔ میں نے قریباً سبھی کتابیں لپیٹ لپاٹ کر دھر دیں اور ہر شاعر اور ہر ناثر کو اور ہر ادبی تحریک اور دیگر تمام موضوعات کو اِس انداز میں ترتیب دے لیا کہ مجھے اُنھیں تین لفظوں میں بیان کرنا ہے۔ اب صورت یہ بنی کہ اصنافِ ادب کے پرچے سے پہلے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے فون پر سوال کیا کہ ''غالب کے شعری محاسن کو تین نمائندہ لفظوں میں بتائیے''، ''مجید امجد کو تین نمائندہ لفظوں میں سمو دیجیے''۔ اگلے پرچے میں ''فورٹ ولیم کالج کو تین نمائندہ لفظوں میں سمجھائیے'' کی عرض کی۔ اگلے پرچے میں ترقی پسند تحریک کو تین نمائندہ لفظوں میں سمونے کو کہا۔ اِسی طرز پر فارسی زبان و ادب کے لیے تین نمائندہ الفاظ پوچھے۔

امتحان ختم ہوا تو نوٹس کا ایک ایسا ورژن پاس تھا جو اردو ادب کے کسی بھی طالبِ علم کے پاس اِس

سے پہلے نہ ہوگا۔ اِس ایک مہینے میں میں نے فون پر خواجہ صاحب سے تمام پرچوں کی باقاعدہ کلاس پڑھی تھی، اور شاید یہ وہ نعمت تھی جو دنیائے اردو میں صرف اور صرف مجھے حاصل ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب بھی اس حوالے سے کہتے تھے کہ مجھ سے آج تک کسی نے یوں سوالات نہیں پوچھے۔ الغرض یہ افادہ و استفادہ مکمل ہوا اور میں اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوئے بغیر خواجہ صاحب کا شاگرد ہو گیا۔

جب اِن نوٹس کو درست کرکے خواجہ صاحب کے انٹرویو کی صورت میں شائع کرنے کا وقت ملا تو معلوم ہوا کہ یہ کبھی کے ردی والے کو اٹھوائے جا چکے ہیں۔ یہ سنگین غفلت ایک ادبی گناہ تھا جس پر خود کو معاف کرنے کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ایک روز بہاول پور میں ڈاکٹر شفیق احمد کے یہاں حاضری ہوئی۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ خواجہ صاحب کے انٹرویوز مرتّب کرکے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار کے نام سے پنجاب یونی ورسٹی سے شائع کرا رہے ہیں اور کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ یہ خبر پندرہ سال قبل والے ایک ماہ پر محیط طویل ترین انٹرویو کے قلق کو مٹانے کے لیے کسی حد تک اطمینان دینے والی تھی۔

کرونائی ناکارگی کی وجہ سے جن کتابوں کی اشاعت میں بہت دیر ہو گئی اُن میں خواجہ صاحب کے انٹرویوز کا یہ مجموعہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار بھی شامل ہے۔ یہ کتاب تاخیر سے ہی سہی لیکن ۲۰۲۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی پریس لاہور سے شائع ہو گئی۔ اِس کی ضخامت ۴۷۵ صفحات ہے۔ کتاب میں شامل انٹرویوز کی شماریاتی تفصیلات ''ابتدائیہ'' میں مرتبین ڈاکٹر شفیق احمد اور ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے دے رکھی ہیں اور اپنے لائق، لیجنڈری استاد کی شخصیت اور اطراف کے بارے میں تعارفی باتیں لکھی ہیں۔

اس کتاب میں تمام انٹرویوز Semi-structured ہیں[۳]، چناں چہ اِن کے جوابات میں خواجہ صاحب کے اسلوبِ تحقیق اور تنقید کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب خواجہ صاحب کے اندر کا نقاد سامنے لے آتی ہے اور اُنھیں بطور نقاد پیش کرتی ہے۔

اِس کتاب میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اِس پورے متن میں خواجہ صاحب تنقید کے نام پر تاثرات پیش کرتے کہیں نظر نہیں آتے۔ وہ جو بھی رائے قائم کرتے ہیں اُس کے پیچھے توجہ سے کیا ہوا مطالعہ اور اُس کی بنیاد پر تیار (Develop) کیا ہوا مستحکم تجزیہ ہوتا ہے۔ چناں چہ کسی تخلیق کار یا ادبی تحریک یا زبان و بیان وغیرہ سے متعلق تنقید کرتے ہوئے خواجہ صاحب کے نقطۂ نظر میں کوئی واجبی سا فرق آیا ہو تو الگ بات ہے،

کوئی جوہری تبدیلی اُس میں عموماً نہیں ملتی۔ اہم بات یہ ہے کہ اپنا ادبی کیریر شروع کرنے کے محض دس سال کے بعد دیے گئے پہلے انٹرویو میں وہ انتظار حسین کے نتائج پر پہنچنے میں جلدی کرتے[۴]، فیض کو مجید امجد اور ن م راشد کے بعد تیسرے نمبر پر رکھتے[۵]، اور عزیز احمد، محمد حسن عسکری اور سید عبداللہ کے اسلوب و مقامِ تنقید پر واضح پوزیشن لیتے ہیں[۶]۔ یاد رہے کہ اُس وقت یہ رائے ایک نوجوان نقاد کی تھی جو اُس نے انتہائی مشہور اور عالمی طور پر معروف فیض کے بارے میں اُن کی زندگی کے آخری دور میں، اور اپنے استاد ڈاکٹر سید عبداللہ اور عسکری جیسے (اپنا ادبی کام تقریباً مکمل کر چکے ہوئے) تنقید نگاروں کے بارے میں اِن بڑے بڑے ناموں کے سامنے بیچ لاہور میں قائم کی تھی۔ اپنے اِسی انٹرویو میں وہ علامتی افسانے میں انتظار حسین کے یہاں Confusion کی[۷] نیز اردو کے علامتی ادب میں مجموعی طور پر الجھاؤ کی بات بھی پورے وثوق سے کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب چوں کہ نقاد ہیں اِس لیے اُن کی گفتگو کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور اُن کے خیالات میں ارتقا بھی۔ اپنے پہلے ہی انٹرویو میں وہ اردو زبان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی بات کرتے ہیں[۸]، تاہم جب وہ غیر ملکیوں کو اردو پڑھانے کا تجربہ پا لیتے ہیں تو وہ اِس معاملے میں امید افزا خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> یہ جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دور میں سارا زوال آگیا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ جو چند نمایاں لوگ ہم تک پہنچتے ہیں، بہت چھان پھٹک کر زمانہ اُن کو لاتا ہے، باقی لوگوں کو رد کر دیتا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ گویا ماضی میں بہت اچھے لوگ ہوا کرتے تھے، آج نہیں ہیں۔[۹]

زبانِ اردو کے بارے میں پیش کی گئی اِس صرف ایک مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِن انٹرویوز میں خواجہ صاحب کی آراء، ادبی خیالات اور نظریات میں اِس قسم کا ارتقا ایک باقاعدہ اور تفصیلی مطالعے کا موضوع ہے۔

یہاں ارتقا کا مفہوم بھی سمجھ لیا جائے۔ سنجیدہ علمی انسان کے خیالات کا ارتقا عموماً انقلاب کے معنی میں نہیں ہوتا بل کہ پہلی جگہ سے ذرا سا ہٹ کر منتخب کیا ہوا نقطۂ نظر ہوتا ہے جہاں سے وہ چیزوں کو بہتر طور

پر دیکھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ عام طور سے انٹرویو میں کہی گئی بعض باتیں اُتنا علمی پایہ اور حیثیت نہیں رکھتیں جتنا کہ ایک باقاعدہ علمی و تحقیقی تحریر میں رکھتی ہیں۔ اِس کی وجوہات میں انٹرویو لینے والے کا مقصد اور اُس کے سوالات کے ڈیزائن سمیت انٹرویو کے قارئین کا حلقہ ہوتا ہے، کیوں کہ ہر ادبی رسالے اور اخبار وغیرہ کے قارئین کا حلقہ عام طور پر مخصوص ہوتا ہے۔ انٹرویو اکثر عام قارئین کے لیے ہوتا ہے جب کہ علمی و تحقیقی تحریر کا ہدف مختلف سطح کے لوگ اور سکالرز ہوتے ہیں۔

اردو زبان اور اُس کے نفاذ، پنجاب میں پنجابی زبان کے نفاذ اور پاکستانی زبانوں جیسے موضوعات پر خواجہ صاحب کی باتیں اور نظریات بہت دوٹوک الفاظ میں ہیں۔ مثال لیجیے کہ ۲۰۰۸ء کے ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

اردو ایک چھوٹی زبان ہے۔ ہمیں، میرا خیال ہے کہ، حقیقت پسند ہونا چاہیے۔[۱۰]

اِسی طرح ۲۳ جنوری ۱۹۹۵ء کے انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

اردو زبان پنجابی کی ایک تحریری شکل ہے۔[۱۱]

ادب اور زبان دونوں کے بارے میں اُن کے نظریات اور خیالات اِس پوری کتاب کی جان ہیں اور محتاط اندازے کے مطابق کتاب کے متن کا قریب ۸۰ فی صد حصہ اِنہی پر مشتمل ہے۔ کالج، یونی ورسٹی، یونین اور انتظامی معاملات پر بھی بہت سا مواد ہے۔ پاور پالیٹکس سمیت ملک کے سیاسی اور معاشی نظاموں اور دولت کی مساوی تقسیم وغیرہ پر بھی بلیغ تجزیے موجود ہیں۔

کچھ انٹرویوز میں خواجہ صاحب سے کیے گئے خاندانی و ذاتی سوالات زیادہ ہیں جیسے 'اصغر مہدی'[۱۲]، 'سرفراز سید'[۱۳]؛ کچھ میں ذاتی سوالات بالکل نہیں جیسے 'تحسین فراقی'[۱۴]، تاہم ایک انٹرویو ایسا ہے جو خواجہ صاحب کی گھریلو اور خاندانی سمیت پوری علمی، ادبی، تنقیدی اور انتظامی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے یعنی فائزہ بٹ اور رابعہ حجاب کا لیا ہوا انٹرویو[۱۵]۔ اِس انٹرویو میں خواجہ صاحب تقسیم کے حالات، بچپن میں شعر گھڑنے کا تفصیلی قصہ، پتنگ بازی کے شوق اور والدہ کی نسبت والد کو زیادہ پسند کرنے کی وجہ بتاتے ہیں اور روزانہ کئی کلومیٹر واک کو اپنی صحت اور خوش باشی کی وجہ، اور مثالی استاد کے اوصاف[۱۶] کا ذکر کرتے ہیں، اور ساتھ ہی زبان کی ترقی کے اسباب میں معیشت اور Influence کو بنیاد بتاتے ہیں، اور اکبر الٰہ آبادی و

مجید امجد سے لے کر Structuralism تک بہت کچھ کا تفصیلی مذاکرہ کرتے ہیں۔ اِس حوالے سے یہ اِس کتاب کا نمائندہ انٹرویو کہا جا سکتا ہے، جس میں خواجہ صاحب کے بعض جوابات کا اسلوب ویسا باغ و بہار اور رچاؤ والا ہو گیا ہے جس سے تہذیب الاخلاق میں چھپے سر سید احمد خاں کے مضمون ''انشاء اللہ'' میں نیچری کا جاہل کو دیا گیا طویل جواب یاد آتا ہے۔[۱۷] نمائندہ تحریر والی کچھ یہی کیفیت امجد طفیل، ریاظ احمد اور عقیل اختر[۱۸] والے انٹرویو کی ہے جو جدید دور کے اساطینِ ادب اور ترقی پسندی سمیت ادبی مسائل پر خواجہ صاحب کے اہم ترین خیالات اور بعض بھرپور تنقیدی نظریات کا جامع ہے اور مثلاً اکبر کی شاعری کی مابعدِ نوآبادیاتی دور میں Relevance وغیرہ سمیت کئی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اکبر کے بلیک ہیومر (سنجیدہ مزاح) کا درست مطالعہ ہمارے کالونیل دور کی استعماریت کو سمجھنے کی شاہ کلید ہے کیوں کہ وہ سر سید وغیرہ کے ناقد ہیں۔ واضح رہے کہ اکبر، سر سید کے ناقد درست لفظی معنی میں ہیں؛ یہ الگ بات ہے کہ من چاہتے نتائج پر پہنچنے کی جلدی میں بعض شتاب طبیعتیں لفظِ ناقد کو آج کے صحافیانہ معنی میں لے لیتی ہیں اور اِس تفہیم کی بنیاد پر اپنی عمارتِ تنقید و کالونیل مطالعات اٹھاتی ہیں۔

ادب کو ادیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اِس لیے یہ بات کہنا ظاہراً آسان تاہم کم کوشی ہو گا کہ ابتدائی انٹرویوز میں خواجہ صاحب شخصیات پر اور بعد کے انٹرویوز میں موضوعات پر زیادہ بات کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے ادب تخلیق کرنے والے فن کار کو ہمیشہ جائز احترام دیا ہے اِس لیے وہ ادیب کی شخصیت کو ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ پہلے انٹرویو[۱۹] سے لے کر آخری انٹرویو[۲۰] تک ہر ایک میں موضوعات اور شخصیات کا ذکر برابر آتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ سوال کا موضوع پر یا شخصیت پر ہونے کا فیصلہ بنیادی طور پر انٹرویو لینے والا کرتا ہے۔

خواجہ صاحب کا اندازِ گفتگو بہت واضح الفاظ، سامنے کی اصطلاحات اور مخاطب کی تفہیم کی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ زبان کو صفائی سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اصطلاحات کے زور پر گفتگو کرتے ہیں کیوں کہ اصطلاحات سے سمجھنے والا مجمع تعداد میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اِس خوبی کی وجہ سے یہ تمام ادبی انٹرویوز عام لوگوں کی سمجھ میں بھی بہ سہولت آ جاتے ہیں نہ کہ صرف خواص پسند واقع ہوئے ہیں۔ زبان و ادب کے حوالے سے ایسے سادہ اسلوب میں گفتگو کرنا آسان نہیں ہوتا، لیکن خواجہ صاحب کی گفتگو میں یہ گن بہ طورِ

خاص پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ مزاج میں ضبط کا مادّہ ہے جو ایک محمود انسانی صفت ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے شعری ذوق کو جماندرو (Genetic) بتایا ہے[۲۱]، لیکن کیریر کے ابتدائی دور میں اپنے شاعری سے رک جانے کو بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے جو مزاج میں ضبط کو ظاہر کرتا ہے۔ تنقید میں اُن کے ضبط کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے انگریزی ادبی تنقید اگرچہ براہِ راست پڑھ رکھی ہے اور اُن سے کیے گئے سوالات میں مغربی شخصیات و ادبی تحریکوں کا ذکر بھی ہے، لیکن وہ اپنے جوابات میں بہت ہی کم مغربی نقادوں یا کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو مغرب اور مغربی ادبی معیارات کے انہدام کی نعرہ بازی یا محض خواہش سے بھی بالکل پاک ہے۔ یہ گفتگو مشرقی تنقید کے ایسے نمونے پیش کرتی ہے جس سے حالی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ان مصاحبوں میں ایک اور بات بھی واضح نظر آتی ہے کہ خواجہ صاحب ادبی تنقید کے مثبت رویوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ متن کے پڑھنے پر زور دیتے نظر آتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ لوگ اہم ادبی متون کو ایک سے زیادہ بار پڑھیں۔ نیز وہ تنقید کا جواب تنقید سے اور جواب ردِ جواب والی کسی تحریک کا نہ تو حصہ بنتے نظر آتے ہیں اور نہ اِس رجحان کی کہیں تحسین کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی ایک خاص صفت انٹرویو نگار کے ہاتھوں ٹریپ نہ ہونا اور گفتگو کا سٹیرنگ اپنے کنٹرول میں رکھنا ہے۔ ادیب شاعر اور نقادوں کے انٹرویو لینے والے لوگ بہت چالاکی سے ایسے سوال کرتے ہیں جن کے جواب میں تعلّی کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور جسے بعد میں بہت اچھالا جاتا ہے۔ پونے پانچ سو صفحات کے اِس متن میں خواجہ صاحب کہیں ایسی صورت حال میں گھرتے اور تعلّی کرتے نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر؛ جب عمران نقوی نے اُن سے سوال پوچھا کہ ''آج کا عہد کس ادبی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے؟'' تو اُن کا جواب آیا:

> میرا خیال ہے کہ اِس وقت ہمارے ادب میں کوئی ایسی بڑی شخصتیں موجود نہیں جس کے حوالے سے ہمارا دور مستقبل میں پہچانا جاسکے۔[۲۲]

اِس قسم کے دو دھاری سوالات بہت جھگڑے پیدا کرتے ہیں۔ یہ انٹرویو ۷ا جون ۲۰۱۲ء کا ہے، یعنی جب خواجہ صاحب نے یہ رائے ظاہر کی اُس وقت مشتاق احمد یوسفی، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ موجود تھے۔ خواجہ صاحب کا دبنگ نقاد ہونا اور اپنے تنقیدی نظریات کو تاثرات کے

بجائے مطالعے اور مسلّم تنقیدی معیارات پر استوار کرنے کامزاج اِس ایک جواب سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اِس کتاب کی سب سے رواں دواں تحریر "ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: باتیں اور ملاقاتیں" ہے جو ڈاکٹر محمد سلیم مظہر کے رشحاتِ قلم ہیں۔ یہ تحریر پس نوشت (Endnote/ Prologue) کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ ڈاکٹر سلیم مظہر نے خواجہ صاحب سے تعلق کو اس طرح محبت میں ڈوب کر لکھا ہے کہ پانچ صفحوں کی یہ تحریر ختم ہونے سے پہلے قاری کسی بھی اور چیز کی طرف توجہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

مصاحبوں کی اِس کتاب پر پانچ ملاحظات بھی پیش ہیں:

۱۔ اول تو یہ کہ کتاب کی پروف ریڈنگ ذرا بہتر ہونی چاہیے۔

۲۔ دوسری ضروری چیز یہ کہ خواجہ صاحب جدید لسانیات کے بعض موضوعات پر سنجیدہ مطالعہ رکھتے ہیں، اِس لیے اُن کا ایک ایسا انٹرویو بھی ہونا چاہیے جس میں لسانیات پر کچھ سوالات شامل ہوں؛ کتاب میں موجود انٹرویوز میں اِس موضوع پر کوئی خاص سوالات نہیں ہیں۔

۳۔ تیسری چیز مصاحبوں کے دوران معرضِ گفتگو میں آنے والی شخصیات، کتابوں/ رسالوں اور ادبی تحریکوں کا اشاریہ ہے جس کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ چوتھی ضروری چیز موضوعات کا اشاریہ ہے، جسے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کی طرز پر بنانے کی سفارش کی جاتی ہے۔[۲۳]

۵۔ آخری بات یہ ہے کہ انٹرویو کو تحریر میں ڈھالتے وقت علاماتِ انشا و رموزِ اوقاف کو ذرا زیادہ توجہ سے استعمال کرنا چاہیے؛ ہر جگہ صرف کامہ یا فل سٹاپ کفایت نہیں کرتا۔

حواشی

---

۱ اِس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں اور تیسرا ۲۰۲۱ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔

۲ مرزا سلامت علی دبیرؔ کا یہ مصرع اُن کے اُس مشہور مرثیے "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" میں شامل ایک شعر کا ہے۔
ملاحظہ ہو: ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ، مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل (حکومتِ ہند)، ۲۰۰۲ء)۔

۳ یعنی اِن مصاحبوں میں پہلے سے بتائے ہوئے سوالات بھی ہیں اور موقع پر گھڑے ہوئے سوالات بھی۔

۴ ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر (مرتبین)، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی پریس لاہور، ۲۰۲۱ء)، ۱۱۔

۵ ایضاً، ۱۵۔

۶ ایضاً۔

۷ ایضاً۔

۸ ایضاً، ۱۳۔

۹ ایضاً، ۲۳۴۔

۱۰ ایضاً، ۲۳۴۔

۱۱ ایضاً، ۴۸۔

۱۲ ایضاً، ۹۔

۱۳ ایضاً، ۴۹۔

۱۴ ایضاً، ۱۷۔

۱۵ ایضاً، ۲۲۸۔۲۵۱۔

۱۶ ایضاً، ۲۳۳۔

۱۷ خواجہ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (محقق ایڈیشن) (لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۲۰ء)، ۳۲۷۔

۱۸ ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر (مرتبین)، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار، ۴۱۰۔۴۵۰۔

۱۹ ایضاً، ۹۔

۲۰ ایضاً، ۴۵۹۔

۲۱ ایضاً، ۲۲۹۔

۲۲ ایضاً، ۲۹۳۔

۲۳ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا پہلا ایڈیشن ۱۷۶۸ء-۱۷۷۱ء میں ۳ جلدوں میں اور آخری پرنٹ ایڈیشن ۲۴۴ برس کے بعد ۲۰۱۰ء میں ۳۲ جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ اِس کا سولھواں ایڈیشن تھا۔ آخری پرنٹ ایڈیشن کے ۲ جلدوں پر مشتمل اشاریے کا فارمیٹ علمی دنیا میں مثالی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو کی اچھی کتابوں میں انڈیکس کی مختلف صورتوں کو اِسی فارمیٹ میں بنایا جانا چاہیے۔